سنت

از

علامہ سید سلیمان ندوی
قدس اللہ سرہ

سنّت

سُنّت

خوشی کی بات ہے کہ کچھ لوگوں میں آج کل مذہبی تحقیقات کا شوق پیدا ہو رہا ہے، گو وہ ہمارے نقطۂ نظر سے آج کتنے ہی دور ہوں، مگر بہر حال ان کا یہ شوق اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ انہوں نے اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اپنے لئے تضییع وقت نہیں سمجھا، گو اس کا افسوس ہے کہ کامل تحقیق سے پہلے اپنے غور و فکر کے نتائج کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دینا ممکن ہے کہ بہتوں کی ٹھوکر کا باعث ہو، حق کی اشاعت ضروری ہے، لیکن شائع کرنے والے پر اس کی بڑی ذمہ داری آتی ہے کہ وہ پہلے حق کا حق ہونا اچھی طرح سمجھ لے۔

اردو کے ایک ادبی (۱) رسالہ میں ماہ بماہ ایسے مضامین نکل رہے ہیں، جن میں اس قسم کی تحقیقات کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، خصوصاً ایک خاص صاحب (۲) کے مضمون اور بھی زیادہ دلچسپ حقائق کا مجموعہ ہوا کرتے ہیں، جن کا سلسلہ خدا خدا کر کے اب تمام ہوا ہے، میں نے اس سلسلہ مضمون کے بعض ٹکڑوں کو

---

(۱) رسالہ نگار لکھنؤ

(۲) نیاز فتح پوری

اس وقت بھی پڑھا تھا، جب وہ پہلے پہل معارف میں چھپنے کی خاطر بھیجے گئے تھے، اور اب بھی دیکھا، پھر موصوف کے خیالات سے اکثر خطوط و مکاتیب کے ذریعے بھی واقفیت ہوتی رہی، مگر ان تمام معلومات کے بعد بھی موصوف کے نظریات میں کوئی خاص اصول مد نظر نہیں معلوم ہوتا، میں نے ایک دفعہ ان کو یا ان کے ایک اور ہم خیال سب جج صاحب کو لکھا تھا۔

گاہ بردل زندو گاہ زند بر ایمان
یارِ زلف تو ندانم کہ چہ درسر دارو

یہی شعر اب بھی پڑھتا ہوں ہمارے دوست نے اسلامی احکام کی ایک طویل فہرست دی ہے، جو قرآن پاک میں مذکور نہیں، اور ان کا ماخذ صرف حدیث ہے، مجھے تو ان میں سے اکثر احکام قرآن پاک میں نظر آتے ہیں۔

اصول فہم قرآن

میں نے ایک سے زائد بار لکھا ہے کہ اس قسم کے مباحث میں جزئی باتوں کی تحقیق میں پڑنا بیکار ہے، ضرورت یہ کہ ان کے اصول کلیہ پر بحث کی جائے جن کے اندر یہ تمام جزئیات داخل ہیں، مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کے مستنبط کرنے کے کیا اصول ہیں؟ ہمارے یہاں اصول فقہ کا بڑا حصہ انہی مباحث کی تفصیل میں ہے، اور اس میں وہ اصول بتائے گئے ہیں، جن کی بنا پر کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کا استنباط کر سکتے ہیں

مثلاً بحث یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی ایسا لفظ یا محاورہ ہے، جس کے متعدد معنی ہیں، یا جس کے حقیقی معنی یا مجازی معنی مراد ہونے میں شک ہو تو تعیین کیونکر ہو گی، یا یہ کہ اس کے معنی تو معلوم ہوں، لیکن اس کے شمول میں شک ہو کہ کتنے افراد کو یہ شامل ہے، یا یہ بحث ہو کہ یہ حکم مطلق ہے، یا اس کے اندر کوئی استثناء یا تخصیص بھی ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے معلوم کرنے کے کیا قواعد ہیں؟

پھر یہ کہ ایک عبارت سے مطلب نکالنے کی متعدد صورتیں ہیں، ایک تو صاف صاف لفظوں سے مطلب نکلتا ہے، ایک اس کے عنوان بیان سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے اشارات وکنایات سے کچھ سمجھا جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی بات قرآن پاک کے لفظوں میں مذکور نہیں مگر اس کے عنوان بیان اور اشارات وکنایات سے مفہوم ہوتی ہے، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قرآن میں نہیں۔

کیا جس طرح آج آپ کو قرآن پاک کی آیتوں کے نزول کے ماحول میں سینکڑوں برس کی دوری کے باوجود اس کے متعلق بیسیوں نکتہ آفرینیوں کا حق حاصل ہے، یہ حق خود اس کو حاصل نہ تھا، جس پر یہ قرآن اترا، اور جس کو اس کے تبیین اور تشریح کا حکم تھا؟

تفاوت ذہن

فرض کیجئے کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن میں یہ حکم نازل ہوتا ہے کہ "صبح سے شام تک روزہ رکھو" اب ایک شخص آکر پوچھتا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے بھولے سے کھا لیا، کیا میرا روزہ صحیح ہوا؟ آپ نے فرمایا ہاں، بھول چوک معاف ہے، روزہ صحیح ہوا، اب سوال یہ ہے کہ آپ نے جو مسئلہ بتایا، اصولاً یہ قرآن کے اندر تو مذکور ہے مگر خاص روزہ کے حکم کے ساتھ مذکور نہیں، تو کیا کہا جائے گا کہ یہ

حکم قرآن کے اندر نہیں اور یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن میں دوسری بات کہتا ہوں نہ دنیا میں تمام انسان ایک ہی قابلیت وذہانت اور فہم کے نہیں ہوتے دیکھئے کہ آج آپ کو جو نکتہ آفرینیاں سوجھتی ہیں، وہ نہ پہلے کسی کو سوجھیں اور نہ خود اس زمانہ کے بہت سے آدمیوں کو سوجھتی ہیں، قرآن پاک ہر آدمی پڑھتا ہے مگر ایک صاحبِ علم کو اس کے لفظ لفظ سے جو حقائق و معارف معلوم ہوتے ہیں وہ ایک عام آدمی کو نہیں معلوم ہوتے۔

احادیث سے چارہ نہ تھا

جب یہ مسلم ہے، کہ افراد انسانی کی عقلیں متفاوت ہیں، اور ان کے فہم وذہانت کے معیار مختلف ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت پر قرآن میں ایک حکم نازل ہونے کے بعد اگر وہی یا اس سے بظاہر کسی قدر مختلف کوئی بات پیش آئے، یا کسی صحابی کو یہ شک پیدا ہو کہ یہ واقعہ اس کلی حکم کے تحت میں ہے یا نہیں، تو اب وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کیا صورت اختیار کرتے؟ ظاہر ہے کہ یہی ممکن اور موزوں صورت ہو سکتی تھی کہ وہ صاحب وحی علیہ السلام سے آکر دریافت کرتے، پھر سوال یہ ہے کہ جب وہ آکر پوچھتے تو آنحضرت صلعم کیا کرتے، خاموش رہتے، یا قرآن پاک کی اس آیت کے بقیہ الفاظ کو جن کے سمجھنے یا جس کو اپنی صورت واقعہ پر منطبق کرنے میں، ان کو شبہ پیدا ہو رہا ہے، دہرا دیتے یا یہ کرتے کہ جو گتھی ان کے سامنے تھی، اس کو سلجھا دیتے، اور بات صاف کر دیتے، ظاہر ہے کہ یہی آخر صورت قابل اختیار تھی، اب ایسی حالت میں کیا، ان اصحابی کے لئے یہ ناجائز قرار دیا جاتا، کہ اپنی صورت واقعہ کو دربار رسالت میں اپنے سوال کو اور آپ کے جواب کو، کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرتے، یا اگر کسی دوسرے کو وہی صورت حال پیش آتی، تو اس کو وہی حل نہیں بتاتے، کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس کو ناجائز اور ناروا نہیں، کہہ سکتا، یہی صورت حال ہے،

جس کا نام اصطلاح میں "حدیث" ہے۔
اس کو کسی مثال میں دیکھئے تو واضح ہو جائے گا قرآن پاک میں ہے کہ

لَاتُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ
اللّٰهُ لَكُمْ سورہ مائدہ 5:87

خدا نے تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کی
ہیں' اس کو اپنے اوپر حرام نہ کرو'

ایک صحابی آکر پوچھتے ہیں کہ یارسول اللہ (صلعم) میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں' بلکہ شادی کا جذبہ جن اسباب سے انسان میں پیدا ہوتا ہے' انہی کو کاٹ ڈالوں' آپ نے فرمایا' یہ جائز نہیں ہے' اس کے بعد قرآن پاک کی آیت مذکور پڑھی' جس تک ان صحابی کی نظر نہیں پہنچی تھی' تو کیا ان اصحابی کے پوچھنے اور آپ کے جواب دینے کے واقعہ کو کسی سے بیان نہ کیا جائے اور اگر کسی تابعی کے ذہن میں وہی سوال پیدا ہوتا ہو تو کسی صحابی کیلئے جائز نہ تھا کہ اس واقعہ کو اس کے سامنے دہرائے اور اس کے شک کو دور کرے' اگر یہ جائز تھا اور ہے تو اسی کا نام روایتِ حدیث ہے'

روایت سے چارہ نہیں'

روایت سے دنیا میں کسی فن' کسی مذہب' کسی حکومت' کسی انسانی کاروبار کو کبھی بھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا' ظاہر ہے کہ ہر انسان' ہر واقعہ' ہر تجربہ' اور ہر حادثہ کے وقت بذات خود موجود نہیں رہ سکتا' ایسی صورت میں غیر موجود اشخاص تک اس واقعہ تجربہ اور حادیث کو پہنچانے کی روایت کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی' خواہ وہ زبانی ہو' یا تحریری ہو' یا ان لوگوں تک جو اس زمانہ کے بعد آئیں' پہنچانے کا ذریعہ روایت کے سوا کوئی دوسرا موجود نہیں ہے' دنیا کے تمام فنون' مسائل' مخترعات' اور

واقعات وحوادث کی نقل اور علم اسی طرح دنیا میں عہد بعہد پہنچا' اور پھیلا ہے' تو پھر کیا اسلام دنیا سے کوئی انوکھا' واقعہ ہے' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرامین واقوال کو دوسروں تک یا آئندہ آنے والوں تک پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کیا جاتا۔

آج کے یہ نئے مفسرین اور یہ جدید "بانیان مذاہب" یہ بالفرض اپنی امت کے امام اور مقتدا بن جائیں' تو ان کی ذاتی تحقیقات ان کی کاوشیں' نکتہ آفرینیاں ان کی امت کے ان افراد تک جو ان کے حلقہ درس سے دور ہیں' یا آج سے سینکڑوں بعد آئیں گے' پہنچانے کا تحریری یا زبانی روایت کے سوا' اور کیا ذریعہ ہوگا' خصوصاً اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابھی کاغذ کی صنعت بھی اس ملک میں نہیں' لکھنے پڑھنے کا رواج بھی کم ہے' اور ڈاک تار' برقی مشین' پریس' اور چھاپہ کی ایجاد کو ابھی ہزار برس باقی ہیں'

آج دنیا میں بڑی بڑی قوموں کی تاریخیں' بڑے بڑے علماء کے خیالات' پرانے مصنفین کی تصنیفات ہم تک کس طرح پہنچی ہیں' خود قرآن پاک ہم تک کس طرح پہنچا ہے' اسی تحریری یا تقریری روایت کے ذریعہ سے' فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ قرآن پاک ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی روایت ہے' اور احادیث چند انسانوں کی' مگر ایسے انسان جن کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان کا سلسلہ سند ہمارے پاس محفوظ ہے' اس لئے قرآن وحدیث میں جو فرق ہو سکتا ہے' وہ وثوق اور اعتبار کی زیادتی اور کمی کا اور قرآن وحدیث کے درمیان اس نسبت کو ہر مسلمان بلکہ ہر اہل حدیث تسلیم کرتا ہے۔

اس لئے جس طرح دنیا میں عام روایتوں کے صحیح یا غلط ہونے کی تنقید کے

اصول ہیں، وہی حدیث کی بھی تنقید کے اصول ہیں، ہم سے جب کوئی بات کہی جاتی ہے، تو ہم اوس کو کس طرح جانچتے ہیں؟ اسی طرح نہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے جس سے بیان کیا تھا، وہ کیسا تھا، جس وقت یہ واقعہ ہوا، وہ اس میں موجود تھا یا نہیں، جس شخص سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے، اس کے عام حالات سے یہ بات لگتی ہوئی ہے یا نہیں، یہی چیزیں ہیں جن کا نام اصول حدیث ہے۔

اسلام کی تاریخ برباد ہو جائے گی

اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک واقعہ، ایک ایک قول، اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا، اور ان کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے، اگر اسلام کے ان نئے محسنوں کے خیالات مان لئے جائیں، تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا، اور صحابہ سے لے کر آج تک وتمام اخیار واکابر جو اُمّت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے، وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے کیا اسلام پر احسان ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لیکر آج تک خلفائے راشدین، تابعین، آئمہ مجتہدین علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوال نبوی کی تقلید واتباع کرتے رہے ہیں، لیکن اگر آج کے اجتہادات مان لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک، انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں ان کے اقوال واجتہادات واستنباطات کے سننے والے موحد، سچے دیندار اور کتاب اللہ کے سچے پیرو ثابت ہوں گے، اور یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن سخت ناکام رہا، اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے جنہوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا اور وہ کام کیا، جو نہ خود رسول نے کیا، نہ ابوبکر صدیقؓ نے کیا نہ عمر فاروق نے کیا، نہ عثمان غنیؓ نے کیا، نہ علی مرتضیٰؓ نے کیا، نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے کیا، اور نہ دوسرے آئمہ مجتہدین سے ہو سکا، اس کے بعد کوئی بتائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی، یا نہیں، اگر تھی تو وہ کب، اور اس کی تاریخ کہاں ملے گی، اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفہ آسمانی دنیا میں اور کون ہو گا، کیا کسی مسلمان کی غیرتِ ایمانی اس خیال کو جائز رکھتی ہے؟

احادیث کا کتنا حصہ قابل بحث ہو سکتا ہے

بہر حال آیئے غور کریں کہ احادیث میں کیا کیا ہے، اور اس کے کتنے حصے پر بحث کی جا سکتی ہے، احادیث کا بڑا حصہ در حقیقت تاریخی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے حالات، سوانح، اور واقعات کی روایتیں ہیں، ظاہر ہیں کہ یہ کوئی قابل بحث چیز نہیں، یہ تاریخ کا اسی طرح حصہ ہے، جس طرح دنیا کی اور تاریخیں ہیں، فرق یہ ہے کہ یہ تاریخ کا ایسا مستند و معتبر حصہ ہے، جس سے زیادہ معتبر اور مستند حصہ دنیا میں موجود نہیں، مصر، ہندوستان، بابل، نینوئی، سیریا، یونان و روم کس ملک اور کس قوم کی تاریخ ہے، جو اس استناد اس اعتبار، اس سلسلہ کے ساتھ محفوظ ہے اور جو تنقید روایت کے اصول پر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ اخلاق و حکم کا ہے، جس میں عقل و حکمت کی عمدہ عمدہ باتیں مثلاً جھوٹ کی برائی، عدل کی تعریف، علم کی خوبی وغیرہ بیان کی گئی ہیں، جن کی قرآن

کے علاوہ خود فطرت انسانی تصدیق و تائید کرتی ہے، کیا یہ رد کے قابل ہیں؟

۳۔ تیسری چیز عقائد ہیں۔

اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کے سوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غالی ظاہر یہ ________ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہو سکتا ہے کیونکہ عقیدہ نام ہے یقین کا، اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ وحی اور اس وحی کا تواتر ہے اس لئے عقائد کا مبنی صرف قرآن پاک یا احادیثِ متواترہ ہیں، ظاہر ہے کہ احادیث متواترہ کا مطلق وجود نہیں، یا ایک دو سے زیادہ نہیں، ایسی حالت میں عام احادیث عقائد کا مبنی نہیں قرار پا سکتی ہیں، عموماً احادیث روایتِ احاد ہیں، اور ان کا ایک حصہ مستفیض ہے یعنی صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی ہے، اس لئے یہ روایتیں صرف قرآن پاک کی آیات کی تائید میں کام آسکتی ہیں، مستقلاً اون سے عقائد کا ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ اب رہ گئے احکام، ان کے لئے مستفیض و احاد سب کچھ کار آمد ہیں، دنیا میں تمام عملی کاروبار اسی پر چل رہا ہے، ایک آدمی تنہا آپ کو آکر اطلاع دیتا ہے کہ فلاں شخص آپ کو بلاتا ہے آپ بے چون و چرا اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں، کبھی سوال و جواب نہیں کرتے، کہ اس نے بلایا بھی ہے، یا نہیں، ہاں اگر کسی قرینہ سے شک ہوتا ہے، تو سوال و جواب کر لیتے ہیں، یہی سب صورتیں احادیث میں بھی جاری ہیں، مثلاً اگر کوئی حدیث کسی دوسری زیادہ معتبر روایت کے خلاف ہو، قرآن کے خلاف ہو، یا اور کوئی بات اس کے مخالف نظر آئے، تو ایسے موقع پر یقیناً صاحب تحقیق کو حق ہے کہ اس پر بحث کرے۔

احادیث قرآن سے ماخوذ ہیں؟

بہت سے علمائے محققین کی طرح میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ احکام واخلاق کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے، وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہے اور چونکہ وہ خود صاحبِ وحی کا بتائید الٰہی وبشرحِ ربانی استنباط ہے اس لئے بشرط ثبوت وہ بھی یقینی اور واجب التعمیل ہے، قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "تبیین" کھولنا، اور "اراءت" دکھانا ہے، اس موقع پر ہم کو بے شک یہ گلہ ہے کہ ہمارے علماء اور خصوصاً علمائے متاخرین نے اس حیثیت سے قرآن پاک کی خدمت کم کی، حالانکہ صحابہ اور آئمہ مجتہدین نے اپنے اجتہادات اور استنباطات میں ہمیشہ قرآن کو سب سے اول پیش نظر رکھا، لیکن انہوں نے فن کی حیثیت سے اس کو مستقل نہیں کیا، ان کا زمانہ تدوین فن کا نہ تھا یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جس طرح کتبِ فتاوی کی سہولت نے لوگوں کو فقہ سے اور کتبِ فقہ کی سہولت نے حدیث سے باز رکھا، اسی طرح حدیث کی سہولت اور ابواب کی تقسیم نے لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنے سے باز رکھا، کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ الگ الگ عنوانوں اور بابوں میں درج نہیں، اس لئے لوگوں کو تلاش میں دقت ہوتی ہے، پھر قرآن سے استنباط کر لینا ہر عامی کا کام نہیں، علماء میں سے جنہوں نے احکام القرآن پر کتابیں لکھیں، انہوں نے بھی تفسیری ترتیب کو چھوڑ کر فقہی ترتیب کو اختیار نہیں کیا، جس کی وجہ سے جو مشکل لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع ہونے سے پہلے پیش آتی تھی، وہ پھر باقی رہی، بہر حال ضرورت ہے کہ ان عقائد القرآن اور اخلاق القرآن پر ہمارے علماء مفصل کتابیں لکھیں، آج بھی جو لوگ قرآن پاک کے ساتھ شغف کا اظہار کر رہے ہیں، اور قرآن ہی کو صرف حجت جانتے ہیں، وہ بجائے اپنے موجودہ طرز عمل کے قرآن واحادیث کے باہمی تعلق وارتباط پر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کام کرتے، تو اسلام

کے لئے کتنا بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیتے، مگر افسوس ہے کہ اس کے بجائے اور بھی تفریق وانتشار کا باعث ہوگا، جس کی مثالیں چند ہی سال میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں نظر آتی ہیں۔

بہر حال اس غلط طریقہ کے سوا ایک اور غلط مبحث بھی ہو رہا ہے۔

حدیث وسنت میں فرق

آج کل لوگ عام طور سے حدیث وسنت میں فرق نہیں کرتے، اور اس کی وجہ سے بڑا مغالطہ پیش آتا ہے، حدیث تو ہر اس روایت کا نام ہے، جو ذات نبوی کے تعلق سے بیان کی جائے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کا واقعہ ہو یا ایک ہی شخص نے بیان کیا ہو، مگر سنت دراصل عملِ متواتر کا نام ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل فرمایا، آپ کے بعد صحابہ نے کیا، پھر تابعین نے کیا، گو یہ زبانی روایت کی حیثیت سے متواتر نہیں، مگر عملاً متواتر ہے، اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک واقعہ روایت کی حیثیت سے مختلف طریقہ سے بیان کیا گیا ہو، اسلئے وہ متواتر نہ ہو مگر اس کی عام عملی کیفیت متواتر ہو، اس متواتر عملی کیفیت کا نام سنت ہے۔

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی فرضیت کے بعد تمام عمر دن میں پانچ دفعہ پڑھتے رہے، آپ کے بعد تمام صحابہ کا یہی طرز عمل رہا، یہی تابعین کا رہا، اور یہی روئے زمین کے تمام مسلمانوں کا رہا، ان کا بھی جو بخاری ومسلم کے وجود سے پہلے تھے، اور ان کا بھی جو اس کے بعد پیدا ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پانچ وقت کی نماز اصطلاحی روایت متواترہ سے ثابت ہو یا نہ ہو، لیکن عمل متواترہ سے بلاشک وشبہ ثابت ہے، تیرہ سو برس زائد سے آج تمام دنیا کے مسلمان جن کے عقائد، اعمال، خیالات، اخلاق، زبان، تمدن، وطنیت اور زمانہ میں بے حد اختلاف اور تفاوت ہے، تاہم اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کے اصحاب دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھا کرتے تھے' فلاں فلاں اوقات میں پڑھا کرتے تھے' اور فلاں فلاں ارکان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے' یہ تواتر عملی ہے' جس کا انکار مکابرہ ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان پانچ اوقات کا تعین اور اس طرح طریقہ نماز بخاری یا مسلم یا ابو حنیفہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہم کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہے۔ یہ وہ عملیت ہے جو اگر بخاری یا مسلم دنیا میں نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اسی طرح عملاً ثابت ہوتی' اگر دنیا میں بالفرض احادیث کا ایک صفحہ بھی نہ ہوتا تو بھی وہ اسی طرح جاری رہتی' احادیث کی تحریر و تدوین نے اس طرز عمل کی ناقابل انکار تاریخی حیثیت مثبت کر دی ہے' تو کیا پھر اس بنا پر کہ اس عملی کیفیت کو دوسری یا تیسری صدی کے کسی محدث نے الفاظ و تحریر میں قلم بند کر دیا' وہ تواتر حد اعتبار سے گر گیا؟

عملی روایت میں اختلاف

اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض عملی روایات میں بھی تو اختلاف ہے' روایتوں میں ہے کہ آپ یا صحابہؓ رفع یدین کرتے تھے' بعض میں ہے کہ نہیں کرتے تھے' بعض میں ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے' دوسری روایت میں ہے کہ ناف پر ہاتھ باندھتے تھے' ایک میں ہے کہ آمین زور سے کہتے تھے' دوسری میں ہے کہ آہستہ کہتے تھے' آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں عملاً کیونکر درست ہو سکتے ہیں' میرا جواب یہ ہے کہ اس مشکل کے حل کی بھی وہی تدبیر ہے جو دنیا کے دوسرے روایتی واقعات کے حل میں اختیار کرتے ہیں اگر آپ کے سامنے کسی نادیدہ واقعہ کے متعلق دو قسم کی مختلف روایتیں آتی ہیں' تو آپ کیونکر فیصلہ کرتے ہیں؟ یہی کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں بیان کرنے والوں میں سے کون زیادہ معتبر اور ثقہ ہے؟ یا کس کا بیان

دوسرے یقینی حالات وواقعات سے زیادہ قرین قیاس ہے یہی صورت ان احادیث میں بھی ہے، جتنا حصہ ان عملی روایات کا ایسا ہے جو بلا ادنیٰ اختلاف ثابت ہے، وہ یقینی اور ناقابل رد ہے، اور جتنا حصہ مختلف فیہ ہے اگر ان مختلف پہلوؤں میں کوئی ایک پہلو اصولاً اور قیاساً زیادہ معتبر ہے اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اگر سب پہلو برابر ہیں، تو یہ مان لینا چاہیے کہ ان مختلف طریقوں میں جس طرح بھی کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے۔

فرض کیجئے نماز کے متعلق پانچ اوقات کے عمومی تعین، نمازوں کی تعداد، نمازوں کی عام ہئیت یعنی قیام، رُکوع، سجود، اور حالت قیام قرآن پڑھنے میں اور دوسرے ارکان میں تسبیح و تہلیل کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لئے یہ عملی متواتر ہے اور اس میں کوئی شبہہ اور شک نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ بات کہ رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے، آمین زور سے کہی جائے، یا آہستہ، دووقت کی نماز ایک وقت میں کب اور کہاں پڑھی جاسکتی ہے اُن کے متعلق اگر اختلاف ہے تو تحقیق کرنی چاہیے کہ ان میں سے غالب پہلو کس طرف ہے، اگر آپ کو اس کا پتہ لگ سکے، تو اس کو اختیار کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں طرح سے جائز ہے، اور ان میں سے جو پہلو بھی کوئی اختیار کرے اس پر ملامت نہیں ہے

سنت کی حقیقت

اس تفریق سے معلوم ہو گیا کہ سنت اور حدیث میں عظیم الشان فرق ہے حدیث محض روایت کی حیثیت کا اور سنت اس کے عملی تواتر کا نام ہے، احادیث کو چھوڑ کر قرآن پاک کی بھی یہی صورت ہے قرآن پاک کا حکم ہے کہ نماز پڑھو "اقیموا الصلوٰة"، اور اس کی تفصیلات بھی جا بجا بتادیں، انہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر بتادیا اور فرمایا" صلّو کمارا ء یتمونی" اس طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا، آنحضرت ﷺ تمام عمر، اسی

طرح پڑھتے رہے، قرآن پاک کے الفاظ کی جو عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی، وہی سنت ہے، اور یہ گویا قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، جس کا مرتبہ احادیث کے لفظی روایات سے بدرجہا بلند ہے، سنت کے علاوہ اسی مفہوم کے لئے قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے دوسرے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے مثلاً سبیل اور اسوہ وغیرہ، مگر ان سب کے معنی چلے ہوئے راستہ اور پیروی کے ہیں، یعنی وہ راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھی چلے تمام صحابہ چلے اور اکابر امت چلے، وہ سنت ہے، سبیل ہے، طریق ہے، اور اسوہ ہے، اور یہی وہ مفہوم ہے جس کے لئے امام مالک نے موطا کا لفظ ایجاد کیا، اور اپنے مجموعہ روایات کا نام رکھا، موطا کے لفظی معنی پامال اور روندنے کے ہیں، یعنی وہ پامال اور روندا ہوا راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ گذرے یہی راستہ عملی اسلام کا ہے اور وہی قرآن کی صحیح عملی تفسیر ہے۔

کتاب و سنت

احادیث میں اکثر کتاب و سنت کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبوں میں ہے کہ "تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جا رہا ہوں" "کتاب اللہ اور اپنی سنت" اس حدیث کی تشریح میں سنت سے مقصود ہر لفظی روایت اور عن عن کی حدیث نہیں ہے، بلکہ آپ کا عمل متواتر اور موطا طریق ہے، جو قرآن پاک کی صحیح تفسیر و تشریح ہے،

سنت اور بدعت

آپ نے دیکھا کہ سنت کی حقیقت کیا ہے اور احادیث میں جس سنت کے اتباع کی بار بار تاکید آئی ہے، وہ کیا چیز ہے اور "علیکم بسنتی" میرا طریقہ اختیار کرو،

بعض امور کے متعلق منْ سُنّتی میرا طریقہ کہنا' بعض چیزوں کے متعلق اصبت السّنۃ تم نے سنت کو پالیا کہنے کا کیا مفہوم ہے'

اسی سنت کا مقابل بدعت ہے' جس کے معنی نئی بات کے ہیں' اور ہمیشہ سنت اور بدعت یہ دونوں لفظ مقابل اور ضدین کی حیثیت سے بولے جاتے ہیں' کیونکہ سنت کے معنی ہیں وہ طور طریق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا' اور بدعت کے معنی ہیں اس کو چھوڑ کر اور اس سے الگ ہو کر اپنے لئے کوئی نئی راہ عمل اختیار کرنا' اسی لئے پہلی چیز ہدایت اور دوسری ضلالت ہے۔

کیا سنت عبرانی لفظ ہے؟

اردو کے اسی سابق الذکر رسالہ میں اسی سابق الذکر مضمون نگار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سنت کا لفظ عبرانی "مسناۃ" سے نکلا ہے' یہودیوں نے توراۃ کو چھوڑ کر اس قسم کے مجموعہ روایت کو اپنا ماخذ بنالیا تھا' جس کو وہ مسناۃ کہتے تھے' اسی طرح مسلمانوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو اپنا ماخذ بنایا ہے' اس کا نام بھی اسی لفظ مسناۃ سے لیکر سنت بنالیا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ تحقیق انیق ہر قسم کے اندرونی و بیرونی اسلامی و افرنگی' عربی' و عبرانی تحقیقات کی ٹکسال سے باہر ہے' اور ایسا دعویٰ کرنا اہل علم کی نگاہوں میں اپنی حقیقت کو عریاں پیش کرنا ہے۔

عبرانی لفظ مسناۃ "س" سے نہیں ہے' بلکہ "ش" سے ہے' یعنی شناۃ جو عربی میں ثنی اور اثنین اور مثنیہ کی صورت میں ہے' اس کے لفظی معنی دو کے ہیں' اور یا مکرر اور دہرائے ہوئے کے ہیں' شناۃ تورات کی پانچویں کتاب کا نام ہے' جس کو آج کل عربی میں "تثنیہ" کہتے ہیں' اور غلطی سے اس کا ترجمہ استثناء کر دیا گیا ہے

انگریزی میں اس کا ترجمہ ڈیوٹرونومی ہے، جس کے لفظی معنی وہی ثنی اور مکرر کے ہیں، توراۃ کے وہ وہ قوانین جو پچھلی کتابوں میں مذکور ہیں، اس کتاب میں ان کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ مرتب اور مدون کر کے پیش کیا گیا ہے، اس لئے اس کا نام مثناۃ تثنیہ یا ثنی اور مکرر کہا گیا، خود قرآن پاک نے اپنے اوپر مثناۃ کی جمع مثانی کا اطلاق متعدد آیتوں میں کیا ہے، غور کیجئے کہ اس مثناۃ کے لفظ کو سنت سے کیا تعلق ہے، مثناۃ کوئی ایسا لفظ نہیں جو علمائے سلف اور لغویین عرب کو معلوم نہ ہو، لسان العرب، صحاح جوہری، مجمع البحار، فتنی سب میں یہ لفظی ثنی کے تحت میں مذکور ہے، اور اس کے معنی لکھے ہیں اور اس پر تھوڑی سی بحث کی ہے، سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی راستے کے ہیں، لیکن بول چال میں اس کے معنی، اس طریقہ عمل کے ہیں جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قران پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے۔

قد مَضَت سُنة الاوّلین،	گذشتہ قوموں کا طریق عمل گذر چکا ہے
8:38 (انفال)	
الا انْ تاتیھمُ سنة الاوّلین	لیکن یہ کہ گذشتہ قوموں کا طریق عمل ان
18:55 (کھف)	کے ساتھ برتا جائے،
سنة من قد ارسلنا	ان لوگوں کا طریقہ عمل جن کو ہم نے تم سے
قبلك 8.77 (اسرائیل)	پہلے رسول بنایا،

سنۃ اللہ کا لفظ قرآن مجید میں اس معنی میں کئی دفعہ آیا ہے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً ،	خدا کے طریقِ عمل میں تم تبدیلی نہ پاؤ گے ،
48:23 (سورۃ فتح)	
33: 62 (سورۃ احزاب)	
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلاً	خدا کے طریقِ عمل میں تم تغیر نہ پاؤں گے ،
35:43 (فاطر)	

کیا اس سے بھی زیادہ ہم کو اپنی شہادت کیلئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

سنت اور بدعت کا معیار

مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز قرن اول ہی سے ہو گیا تھا، لیکن غور سے دیکھئے کہ یہ اختلاف زیادہ تر نظریات و آراء کا تھا، جن کو عمل سے تعلق نہ تھا، کیونکہ غیر مادی، غیر محسوس امور کے متعلق کوئی محسوس و مادی عملی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی تھی، مثلاً یہ کہ خلافت مسلمانوں کے مشورے سے ہے، یا نص الٰہی سے ہے، یہ شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سب سے اہم بحث ہے، یا یہ کہ قیامت میں دیدار الٰہی ان ظاہری آنکھوں سے ہو گا، یا نہیں؟ یہ ایک معرکۃ الآراء، اختلافی بحث معتزلہ اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے درمیان میں ہے، لیکن یہ تمام اختلافات نظریاتی حیثیت رکھتے ہیں، ان مسائل میں جن کی حیثیت عملی، مادی اور محسوس تھی، مسلمانوں میں کوئی بڑا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر عملی سنت سب کے پیش نظر تھی، اور یہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز تھا، رفع یدین، آمین بالجہر، وضع ید علی الصدر، قراءت فاتحہ خلف الامام کی بحث اگر فریقین کا غلو اور تعصب علیحدہ کر دیا جائے تو یہ صرف افضلیت کی بحث رہ جاتی ہے جو زیادہ اہم نہیں۔

یہ ہر مذہب کا اصول کلی ہے، خصوصاً اسلام کا اور فطرتاً ایسا ہی ہونا بھی چاہئے کہ

ہر مذہب کا بہترین عہد اور دور وہ ہوتا ہے، جو خود صاحب مذہب کا مبارک زمانہ ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے جانشینوں اور صحبت یافتوں کا، پھر رفتہ رفتہ اس میں ضعف ہوتا جاتا ہے، اور اس کے مذہب کا قوام بگڑتا جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اصل مذہب نہیں، بلکہ وہ ہے، قرآن کا یہ حکم نہیں، بلکہ وہ ہے تو اس کا فرض ہے کہ رسول کے مبارک عہد میں جو طرز عمل اس کو نظر آتا ہے، اس کو اصل مذہب کا معیار قرار دے، اور جو چیز اس عہد میں نظر نہیں آتی، اور بعد کو وہ شامل ہو جاتی ہے، اس کو مذہب سے خارج یعنی بدعت قرار دے، اس اصول کی بنا پر جو بالکل واضح ہے، ہر اوس شخص کا جو اسلام کے اصلی پیکر کی جلوہ آرائی کا مدعی ہے اور قرآن کی صحیح تعلیم کو آج دنیا میں پیش کرنا چاہتا ہے، یہ فرض ہے کہ وہ اس اصلیت اور اس صحیح تعلیم کے خدوخال اس عہد مبارک کی عملی زندگی میں دکھائے، اور یہ بتائے کہ آج جو غلطیاں اس کو نظر آتی ہیں، وہ اس وقت نہ تھیں، بلکہ بعد کو اسلام میں داخل ہو گئی ہیں، مثلاً یہ بتائے کہ اس عہد مبارک میں صرف دو وقت یا تین وقت کی نماز تھی، بعد کو بخاری و مسلم و ابوداؤد مرتب ہوئیں تو مسلمانوں میں پانچ وقتوں کی نماز کا رواج ہوا، پہلے اس طرح نماز پڑھی جاتی تھی، بعد کو اس میں فقہاء اور محدثین نے یہ اضافہ کر دیا، اگر یہ ثابت نہیں ہو سکتا، اور یقیناً ثابت نہیں ہو سکتا، تو یہی ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) اپنے زمانہ میں اپنی وحی کے سمجھنے میں غلطی کی، اور اب اس کو ہندوستان کے عجمی اپنی معمولی صرفی و نحوی لیاقت سے درست کر رہے ہیں، کیا کوئی مسلمان بلکہ انسان بھی ایسا احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے؟

معارف اگست ۱۹۲۹

پھر بحث سنت

کچھ اور اختراعات و الزامات

(۱)

دوستوں کو یاد ہوگا کہ اگست ۲۹ء کے معارف میں ایک صاحب (۱) کے جواب میں "سنت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا جس میں مدعی مذکور کے اس خیال کی تردید کی گئی تھی کہ سنت اور زبانی روایات یا حدیث ایک چیز ہیں، اور اس کے اس اختراع کی غلطی ظاہر کی گئی تھی کہ مسلمانوں کا لفظ سنت "یہودیوں" کے لفظ "مسناۃ" سے ماخوذ ہے، جو یہودیوں کے ان زبانی روایات کے مجموعہ کا نام ہے، جو سنہ عیسوی سے پس و پیش زمانہ میں حضرت موسی علیہ السلام کے تقریبا ڈیڑھ ہزار برس بعد مرتب ہوا تھا۔

اسی مضمون سنت کے چھپنے کے بعد مدعی مذکور نے پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے سوال و جواب کیا، اور اس کے بعد ایک طویل مضمون اپنے مدعا کے اثبات اور

---

(۱) نیاز فتح پوری

میری تردید میں چھپوایا' جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے' اس کے جواب میں انشاء اللہ کوتاہی نہ ہوگی' لیکن موصوف کے مضمون کے لب ولہجہ اور طرز وانداز کے جواب کی توقع کم از کم معارف میں نہ رکھنی چاہیے۔

مجھے یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ معارف کے اس مضمون سنت کو اللہ تعالیٰ نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی' موافقین کے علاوہ بعض مذبذب دوستوں کے شکوک بھی اس سے دور ہوئے'

مگر افسوس ہے کہ اصل مخاطب کو اس سے تشفی نہیں ہوئی' بلکہ اپنی غلطی یا غلط فہمی پر ان کا اصرار اور بڑھ گیا' موصوف کو میرے انگریزی نہ جاننے پر تاسف ہے' یہ تاسف مجھے خود بھی ہے' مگر ان کی تسلی کے لئے بطور اظہار واقعہ یہ امر ان پر ظاہر کر دینا ہے کہ ان کی آرزو کے مطابق میں کم از کم اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلو پیڈیا کے تاریخی و مذہبی مضامین پڑھ اور سمجھ سکوں' انہیں اس کا اطمینان رکھنا چاہیے' اور یہ بات ان کو میری اس تصنیف (ارض القرآن) کو پڑھ کر سمجھ لینی چاہیے تھی' جس کی ابھی انہوں نے اپنے والا نامہ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء میں تعریف و توصیف کی ہے' اور اپنے مضامین میں اس سے سرقہ کا "مخلوت" اعتراف بجا کیا ہے' اور ناظرین بھی ان کے مضامین "قرآن مجید و آثار قدیمہ" اسلامک ریویو اور اشاعت اسلام میں دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

مضمون زیر بحث میں دو قسم کی بحثیں ہیں' ایک لفظی اور دوسری معنوی دونوں بحثوں کو علیحدہ کر دینا ہے' تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے۔

مسنات اور سنت

لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعویٰ ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو "مسناۃ" اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو "سنت" کہتے ہیں' مسلمانوں کا یہ عربی لفظ

"سنت" یہودیوں کے عبرانی لفظ "مسناۃ" سے ماخوذ ہے، دونوں بالکل ایک لفظ ہیں، اور ہم معنی ہیں۔

میں نے اگست ۲۹ء کے معارف میں مدعی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا، اور ثامت کیا کہ اولاً عبرانی لفظ "مسناۃ" "س" سے نہیں بلکہ "ش" سے ہے، یعنی "شناۃ" اور دوم، اس کے معنی عبرانی میں دوسرے، دوہرانے اور اعادہ و تکرار کے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا اطلاق موسیٰ کی پانچویں کتاب پر ہوتا ہے، جس کو یونانی ڈیٹرونومی کہتے ہیں جس کے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہیں، اور عبرانی میں اس کو شنا کہا جاتا ہے اور عبرانی میں شناۃ کہتے ہیں، اور آج کل تثنیۃ الاشتراع (دوبارہ قانون سازی) کہتے ہیں اور ان سب کا ماخذ عبرانی میں "شنا" اور عربی میں "ثنی" اور ان دونوں کے معنوں میں دونوں زبانوں میں دو، دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے اور سنت خالص عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے ہیں، اور اصطلاح میں اس کے معنی وہ طریق ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر قائم رہے، اس کے معنی زبانی روایات کے نہ لغوی ہیں نہ اصطلاحی، اس لئے عبرانی "شناۃ" اور عربی سنت میں کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہیں اور نہ عربی سنت عبرانی شناۃ سے ماخوذ ہے۔

ہمارے مخاطب اول نے اس مضمون کو پڑھ کر 5 دسمبر 1929ء کو مجھے خط لکھا کہ "تمہاری تحقیق غلط ہے، ڈوٹرونومی کے لئے مسنا (س) لفظ ہے، اور شنا بالکل جداگانہ لفظ ہے"، "میں" ایک سے زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کر چکا ہوں، اور اس کی تائید انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے بھی مل سکے گی،

"اگر اس کے معنی آپ سنت سے علیحدہ دکھائیں تو میں ہار مان لوں"

میں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اس کا مطلب یہ تھا کہ شنا توراۃ کی پانچویں کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا ہے، اور تالمود کے ایک حصہ کا نام بھی ہے، یہ کوئی اہم

نقطہ اختلاف نہیں ہے بلکہ اصل چیز "مشنا" کے معنی ہیں، ساتھ ہی میں نے اطلاع دی کہ "مشنا" کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہیں، انہوں نے اس کے ماننے سے بھی انکار کیا، اور لکھا کہ تم کو تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے، جس کے معنی واقعاً تعلیم اور سکھانے کے ہیں، اب اس تازہ مضمون میں ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر وناز کے ساتھ دہرایا ہے، مگر صرف دہرایا ہی ہے، کوئی دلیل یا حوالہ نہیں درج فرمایا ہے۔

اب نقطہ اختلاف دو ہیں۔

1- کیا تورات کی پانچویں کتاب کو بھی عبرانی زبان میں مشناہ کہتے ہیں۔

2- کیا سنت اور مشنا ایک ہیں۔

مشنا توراۃ

تورات کی پانچویں کتاب کو میرے "مشنا" کہنے پر مدعی نے مضحکہ اڑایا ہے اور فرمایا ہے کہ "ایک یہودی بچہ بھی اس کو سن کر ہنس دے گا" مگر میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے مراحل دور ہے، توراۃ کی پانچویں کتاب کا نام "قانون ثانی" اس لئے رکھا گیا ہے کہ قانون اول کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسیٰؑ نے اس کو دوبارہ بیان کیا، جیسا کہ اس کتاب کے آغاز میں تحریر ہے، اس کا عبرانی نام "الوہی دہران" بھی ہے، مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمہ سبعینی کے وقت سے اس کا نام "مشنا توراۃ" مشہور ہو گیا، جس کے معنی "قانون دوم" کے ہیں، اسی لئے یونانی اور اس سے یورپ کی زبانوں میں اس کا نام "ڈیوٹرونومی" یعنی دوسرا قانون پڑا، اور اسی لئے پرانی عربی میں "مشناۃ" اور نئی عربی میں اس کا نام تثنیۃ الاشتراع ہے، یعنی "دوبارہ قانون بنانا" بہر حال ان سب کے معنوں میں دو، دوم، اور دہرانے کا مفہوم

داخل ہے، جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس شنا کا لفظ بولا جاتا ہے، وہ "ش" سے ہے "س" یا "ث" سے نہیں، جیسا کہ مدعی کا دعویٰ ہے، کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادہ ہے وہ "شنا" ہے۔

حوالوں کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبہ جیمس ہسٹینگز وغیرہ) جلد اول ص 596 مطبوعہ 1900ء ملاحظہ فرمائیے، جس میں لکھا ہے کہ اس کا نام ڈیلوٹرونومی عبرانی الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی نسخہ ثانیہ کے ہیں، اس کے بعد انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبز انٹر نیشنل میں لفظ ڈیوٹرونومی دیکھئے اس میں ہے۔

"ڈیوٹرونومی اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ کے قانون کا دہراؤ (یا اعادہ ہے) اب عبرانی لغت میں دیکھ لیجئے کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کے لئے لفظ شنا ہے سنا یا ثنی یا شنہ نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہم کو باور کرانا چاہتے ہیں، جیسا کہ آگے بتفصیل معلوم ہو گا۔

میرے مضمون سنت کی اشاعت کے بعد موصوف نے 5 دسمبر 1929ء کو جو خط مجھے لکھا تھا، اس میں ارقام فرماتے ہیں۔

"شنہ جس کے معنی ڈوٹرونومی کے صحیح لئے ہیں، وہ شنا سے بالکل جدا لفظ ہے، اور اس کا تلفظ مسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون میں ڈوٹرونومی کے لئے ہم کو لفظ ثنی دیتے ہیں،

ع کہے یہ حکم رہے کہئے وہ ارشاد رہے

اگر آپ کے کہنے سے توراۃ پنجم کے لئے مسنا صحیح مانا جائے تو تالمود کے لئے بھی تو آپ نے مسنا اور مسناۃ ہی تلفظ پہلے مضمون میں لکھا ہے، اب یہ التباس کیونکر دور ہو گا۔

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ پنجم اور حصہ تالمود دونوں کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا شنہ یا شنی کہہ کر لاکھ پیدا کیجئے، سب محکمہ تحقیق کے سامنے رد ہو جائے گا، دونوں لفظ قرشت والی "ش" منقوط سے ہیں، اس غیر منقوط یا ث منقوط سے ان میں کوئی لفظ نہیں پڑتا اور ث کا حرف تو عبرانی میں سرے سے موجود ہی نہیں، اس لئے شنہ یا شنی تو عبرانی میں ہو ہی نہیں سکتا۔

اب ہمارے دوست غور فرمائیں کہ کس کی تحقیق پر "ایک یہودی بچہ بھی ہنس دے گا" در سفالین کاسۂ رنداں بخواری منگرید۔
کایں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

شنا، مسنا اور سنت

بہر حال یہ مسئلہ کہ مشنا تالمود مراد ہے، یا مشنا توراۃ ایک ضمنی بحث ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مسناہ" اور عربی سنت ایک چیز ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں، اصل عبرانی لفظ مشنا (ش منقوط) ہے جیسا کہ میرے ٹوکنے پر اب اس دوسرے مضمون میں انہوں نے استعمال کیا ہے، مگر پہلے مضمون میں اس کا عبرانی تلفظ "مسناۃ" بتایا تھا اور یہ اس غرض سے تاکہ سنت اور مسناۃ میں س "ن" اور "ۃ" کا اشتراک ہو جائے اور یہ دعویٰ بآسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور مسناۃ ایک ہیں، اور اب جب انہیں معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شناس ان کے سوا کوئی اور بھی ہے، تو مجبوراً اس کے لئے دوسرے مضمون میں (مشناس) منقوط سے بولے، یاللعجب!

میں نے اپنے سنت والے مضمون میں یہ دکھایا تھا، اور پھر باعلان دعویٰ کرتا ہوں کہ سنت اور شنا میں کوئی لفظی یا معنوی مناسبت نہیں ہے، شنا کے معنی اگر بقول ان

کے زبانی روایات کے ہیں‘ تو سنت کے معنی عربی میں طریق و روش اور راستے کے ہیں قرآن میں سنت کا لفظ انہی معنوں میں بار بار آیا ہے احادیث میں انہی معنون میں استعمال ہوا ہے‘ اور لغت اور اشعار عرب میں بھی ان ہی معنوں میں یہ لفظ بولا گیا ہے‘ قرآن پاک میں ہے لَنْ تَجدَ لِسنُّة اللّٰه تحويْلاً ‘ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم خدا کی ”زبانی روایتوں“ میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے‘ یا یہ معنی ہیں کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے ؟

احادیث میں ہے من سنّ سُنةً حسنة فَلَه‘ اَجرُها‘ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی اچھی ”زبانی روایت“ کرے گا تو اس کو اس قسم کی نیکیاں ملیں گی‘ یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اس کو بھی اس کی نیکیاں ملتی رہیں گی‘

مشہور حدیث ہے اِلنّکاحُ مِنْ سُنَّتی کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ نکاح میری زبانی روایت ہے یا یہ معنی ہیں کہ نکاح میرا طریقہ ہے‘ اشعار عرب میں ہے۔

وَان الائی بالطف مِن ٰال هاشم تاسوا فسنوا للكرام التّا سيا

(آل ہاشم وہ جو طف میں ہیں‘ انہوں نے باہم غمخواری کی‘ تو غم خواری کو شریفوں کا طریقہ بنادیا

”سنو“ کے معنی یہاں عملی طریق و روش و طرز عمل کے ہیں‘ یا زبانی روایت کے‘ زبانی روایت کے معنی ہو بھی سکتے ہیں اور بن بھی سکتے ہیں !؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی‘ اب آئیے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی کی

جائے"" "مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں؟ اس بارے میں میں نے پہلے جو لکھا تھا' اس کو دہرا دیتا ہوں کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ثنیٰ 'مثنیہ 'ثنیٰ وغیرہ کی صورت میں ہے' اور اس کے معنی دہرانے دوبارہ کرنے' اور دوسرا ہونے کے ہیں' مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ اس کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں' میں سوا اس کے اور کیا کہوں۔

صیاد نئی ولا تو نخچیر مکن　　چیزے کہ نخواندۂ تو تفسیر مکن ؎

ان کی تشفی کے لئے ان کے حسب مشورہ میں سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہوں جس پر' ان کا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفوں سے زیادہ ہو انسائیکلو پیڈیا طبع یازدہم کے مضمون تالمود کے شروع میں (جلد 26' صفحہ 380) ہے۔

" تالمود (عبرانی میں: سیکھنا سکھانا) مشتمل ہے' مشنا پر (عبرانی میں (زبانی) دہرانا

پھر اسی کتاب کے اسی ایڈیشن (یازدہم) کی جلد 13 صفحہ 107 مضمون ہیرو (عبرانی) کے ضمن میں ہے۔

"مشنا کا نام عبرانی لفظ "شنا" سے مشتق ہے' جو آرامی لفظ "ثنا" سے مطابق ہے اور اسی لئے یہ شاتک کتاب کے لئے موزوں ہے' جس کے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سکھانے کے ہیں۔

ان دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اس کے اصلی معنی دہرانے یا سکھانے کے ہیں' لفظ زبانی یا زبانی قانون کا اضافہ' اگر کسی نے کر دیا ہے' تو وہ لغت کی حیثیت سے نہیں' بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نام اس کا کیوں پڑا اس کی تائید کے لئے میں لغات عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہوں۔

شناوشنہ	بدل جانا، جدا ہونا، دوبارہ کرنا، دہرانا
شنیم	دو،
شنییم	دوبارہ
مشنہ	دوسرا درجہ، دوسرے درجہ کا، دوچند
مشنا	دوسرا

لغات عبرانی مصنفہ پادری ویلیم ہو پرانسپل، دونٹی کالج، شائع کردہ پنجاب رلجیس سوسائٹی الہ آباد 1880ء صفحہ 420) شنہ کے معنی بھی عبرانی میں دوبارہ کرنا، دوسرا اور پھر کے ہیں، یہی لفظ عربی میں اثنین اثنین اثنتین ثنتہ، تثنیہ، ثنی ثنی، اور ثنی ہے، پہلے تمام الفاظ کے معنی دو اور دوسرے کے ہیں، اور اخیر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہیں۔

مشنا اور اس کے مصدر شنا کے یہی تمام معنی عبرانی انگریزی ڈکشنری، شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) ص 272، 273 میں ہیں، تحقیق کیلئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے۔

انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹرز انٹر نیشنل ڈکشنری ہے اس میں "مشنا" (Midhna) کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے۔

"مشنا (عبرانی مشناہ) یعنی تعلیم، زبانی قانون، عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دہرانے (ری پیٹ) کے ہیں، قدیم بائبلیکل عبرانی میں اس کے معنی، سیکھنے سکھانے کے ہیں، یہ یہودیوں کے روایتی تعلیمات کو کہتے ہیں جو ربیوں کے زیر نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئیں، تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے، جس پر اس کی بنیاد ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ "زبانی روایات" اس کے لغوی معنی نہیں، اس کے لغوی معنی دہرانے اور اعادہ کرنے اور دوبارہ کرنے اور دوسرے درجہ کے ہیں، اسکا اطلاق یہود اپنی زبانی روایات کی کتاب پر اسلئے کرتے ہیں، کہ وہ گزشتہ قانون کا اعادہ ہے، یا

پہلے قانون پر نظر ثانی ہے، یا توراۃ کے مَکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایت کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے، یا قدیم عبرانی کے مطابق اس کے معنی سیکھنے، یا سکھانے کے لے کر، اس کی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بنائی جائے۔

مثناۃ

اب میرا کہنا وہی ہے، جو پہلے کہا جا چکا ہے، کہ جس کو عبرانی میں مشنا یا مشناۃ کہتے ہیں، وہی عربی تلفظ میں مثناۃ ہے جس کے معنی دو یا دوہرانے کے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشنا جس کا ثانی قانونی کتاب پر اطلاق ہوا ہے، اس کے لئے بھی عربی لفظ "مثناۃ" ہے اور اس کی جمع "مثانی" ہے اور خود قرآن پاک نے اس کا کئی مقام پر اپنے اوپر اطلاق کیا ہے۔

ولقد اتَيْنا كَ سبْعًا مِنَ المثانی (الحجر) 15:87	اور ہم نے اے پیغمبر! تم کو "مثانی" میں سے سات دیئے،
نزل احسن الحديث كتابا متشابهاً مثانی (الزمر) 39:23	اس خدا نے اتارا بہترین کلام ایک کتاب جو باہم موافق اور "مثانی" ہے

مثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں، نیز مشنا تالمود کے لئے وہی لفظ عربی میں مستعمل ہے، لسان العرب لفظ ثنی کے تحت میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ ابن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے۔

قيل وما المثناة قال، استكتب مِنْ غير كتاب الله كانه جعَل ما اسْتُكتبَ مِنْ كتاب الله مبدأ وهذا مثنٰی، قال ابوعبیده سألت رجُلاً مِنْ اهل	پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی کتاب کے سوا لکھا گیا، گویا خدا کی جو کتاب لکھی گئی، وہ پہلی تھی، اور یہ دوسری ہے، ابو عبیدہ نے کہا کہ میں نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ سے واقف تھا، اور اس کو پڑھ

العلم بالکتاب الاوّل قَدْعرفها وقرأها عن المثناة فقال ان الاحبار والرُّهْبان من بنی اسرائیل من بعد موسٰی وضعوا کتابًا فیهَا بینهُم علیٰ ما ارادوا من غیر کتا بْ اللّٰه فهُوالمشناة'

چکا تھا پوچھا کہ ثناۃ کیا ہے؟ اوس نے جواب دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب بنالی تھی' وہی مشناۃ ہے'

خاتمہ

کیا عبرانی مشناۃ بعینہ یہی عربی ثناۃ نہیں ہے' اب بھی شک کی گنجائش ہے؟ بہر حال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چہاتے' بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے' یا تالمود کی کتاب' دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ شنا اور شنہ ہے' جس کے معنی بدلنے دہرانے یا دوسرا ہونے یا دوبارہ ہونے کے ہیں' یا سیکھنے کے ہیں' اور سوائے اخیر معنی کے الفاظ ثنہ' ثنی' تثنیہ اور ثنی اس کے مرادف ہیں' اور عربی لفظ سنت کو جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اصطلاحی معنی طریق محمدی کے ہیں' اس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں' سنت کا مادہ س' ن' ن یعنی سنن ہے' اور مشنا یا مشناۃ کا عبرانی میں 'ش' ن' ہ' یا الف اور عربی میں ث' ن' ی ہے' اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرما کر علم اور اسلام دونوں کو اپنا ممنون احسان بنائیں گے' ورنہ ان کی تحقیق کو بقول ان کے ایک یہودی بچہ بھی سن کر ہنس دے گا"۔

آخر میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ "مشنا" زبانی روایات کو بھی نہیں کہتے'

بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس میں یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے' اگر گلستان اخلاقی قصص و حکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ گلستان کے معنی اخلاقی قصص و حکایات کے ہیں۔

دوران تحقیق میں فرماتے ہیں کہ

"مولانا کی یہ دلیل اور بھی پر لطف ہے کہ سنت کا لفظ قرآن میں ہے' اس لئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہیں"

میں نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط ہے۔ لیکن

ع سخن شناس نہ' دلبرا خطا ایں جاست

میں نے خدمت والا میں یہ عرض کیا تھا کہ

"سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے' اس کے لفظی معنی راستہ کے ہیں' لیکن بول چال میں اس کے معنی طریقہ عمل کے ہیں' جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے"۔

ہر صاحبِ بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے' کہ عبرانی لفظ مشناہ (ش) عربی میں مثناۃ (ث) ہے اور جس کے معنی دونوں زبانوں میں دوسرے یا دہرانے یا اعادہ کے ہیں' اور اس سے الگ "سنت کا لفظ ہے' جس کے معنی راستہ اور طریق کار کے ہیں' اور عربی میں یہ دونوں لفظ الگ الگ مستقل صورتوں میں وارد ہیں اور خود قرآن پاک میں ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَیناكَ سَبْعًا مِنَ المثانی ہم نے تم کو "مثانی" میں سے سات دین'

مثانی جمع ہے' واحد کی صورت وہی مثناۃ ہے' اور سنت الگ ہے'

سُنَّةَ الْاَوَّلِیْنَ' پہلوں کا راستہ یا طریقہ یا سنت

اگر شناۃ اور سنت ایک لفظ ہوتے تو عربی میں شناۃ اور سنت دو لفظ موجود نہ ہوتے، اور قرآن ان کو دو لفظ دو تلفظوں کے ساتھ دو معنوں میں استعمال کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ شناۃ اور سنت دو الگ الگ مستقل اور مختلف المعنی لفظ ہیں یہ ہے میرا استدلال جس کی آپ نے غلط تعبیر کی، میرے گزشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہو سکتی ہے،

معارف جولائی 1930ء